بین کرتا ہوا شاعر: عتیق اللہ

کلیدی الفاظ: اخلاقی اقدار# تجریدیت#علامتیت# آزاد تلازمۂ خیال#درد و کرب # تشکیک وخوف#مایوسی# بے چینی# تنہائی بے گانگی# غم وغصہ# جھلاہٹ#اضطرابی کیفیت #بے ہنگم زندگی#ناقدری#نا آسودگی# جھنجھلاہٹ# غم وغصہ# تلخی زماں#احساسِ ناکامی#

ڈاکٹر احمد امتیاز
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ملخص: دورِ حاضر کی شاعری میں عتیق اللہ کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں مثلاً: ایک سو غزلیں، بین کرتا ہوا شہر، عبارت اور تکلم۔ ان کی شاعری زبان و لسان کے اعتبار سے ایک نیا ذائقہ رکھتی ہے۔ان کے یہاں زبان کو برتنے کا انداز نہایت دلچسپ اور عجیب ہے۔ان کی شاعری میں زبان کے تجربے شعری معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔چرند و پرند اورمکروحات کا استعمال جس طرح انہوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں کی ہے اس کی مثال بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔اس لیے عتیق اللہ اپنے معاصرین میں الگ سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ان کی نظموں میں بھی ایک تیکھا پن ہے جو اُن کے شعری تیور کو ظاہر کرتا ہے۔ اس مضمون میں ان کے دو ابتدائی شعری مجموعے کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے ۔

عتیق اللہ ہمارے عہد کے ان چند لکھنے والوں میں سے ہیں جن کے اظہار کی دنیا بہت وسیع ہے۔ بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن تنقید میں بھی انہوں نے بہت معتبر کام انجام دئے ہیں۔قدر شناسی (۱۹۷۸ء)، تنقید کا نیا محاورہ (۱۹۸۲ء)،آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم (۱۹۹۲ء)،تنقیدی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ (۱۹۹۵ء) ترجیحات (۲۰۰۲ء)،بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب (۲۰۰۲ء)،تعصّبات (۲۰۰۵ء)،بیانات (۲۰۱۱ء)،تنقید کی جمالیات (دس جلدوں میں۔۲۰۱۹ء۔۲۰۱۳ء)،مغرب میں تنقید کی روایت (۲۰۱۷ء)،بیب العلومی تنقید (۲۰۱۸ء)،غالب اور اطرافِ غالب (۲۰۱۸ء)،اردو میں تنقید کی روایت (۲۰۱۸ء)وغیرہ، ان کے تنقیدی کارنامے ہیں۔شاعری اور تنقید کے علاوہ

انہوں نے ڈرامے اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے قریب ابھرنے والے شعرأ مثلاً: مصور سبزواری، نشتر خانقاہی، بانی، بشر نواز، شکیب جلالی، پروین شاکر، من موہن تلخ، عادل منصوری وغیرہ کی صف میں عتیق اللہ کا نام بھی شامل ہے۔ ان کے ابتدائی دو شعری مجموعوں ''ایک سو غزلیں'' (۱۹۷۱ء) اور ''بین کرتا ہوا شہر'' (۱۹۷۸ء) کو یہاں موضوع بنایا گیا ہے۔

عتیق اللہ نے شاعری اس زمانے میں شروع کی جب ترقی پسند تحریک پر زوال آ چکا تھا اور جدیدیت اپنے فروغ پر تھی۔ اس دور کے نوجوانوں کے سامنے پرانی تہذیبوں اور قدروں کے مقابلے میں نئی سائنسی دنیا اور اس کی تہذیب تھی۔ قدروں کے اس تصادم میں روایتی رشتوں کا تانا بانا ٹوٹتا جا رہا تھا۔ اخلاقی قدروں کے اس بکھراؤ سے بہت سے نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ عالمی امن کا تصور معدوم ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے حالات میں چاروں طرف جنگ، فسادات اور مختلف قسم کے تنازعات کا بازار گرم ہونے لگا اور ہر شخص اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگا۔ روحانی قدروں میں جو قوتِ مدافعت تھی وہ کمزور ہونے لگی۔ انہیں اسباب و عوامل کے زیر اثر درد و کرب اور تشکیک سے پُر ایک نیا معاشرہ وجود میں آیا۔ جدید شاعری اسی معاشرے کی پیداوار ہے۔ فضا بدلی تو زمانے کی سیاسی، سماجی اور ادبی نقطہ نظر کی یک رنگی اور جکڑ بندی کے خلاف نعرہ بلند کیا گیا۔ تجریدیت، علامتیت اور آزاد تلازمۂ خیال کو بالخصوص شعری بیان میں داخل کر کے روایت سے یک سر انحراف کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح جدید شعرأ نے جدید اسالیب کی طرح ڈالی اور روایت کے جامع تصور کے بجائے حرکی اور بالیدہ شعری تجربات پر زور دیا۔

زمانے کے تغیر نے شعر و ادب کے بنیادی افکار کو بھی متغیر کیا۔ اس لئے درد و کرب، تشکیک و خوف، مایوسی، بے چینی، تنہائی بے گانگی، غم و غصہ، جھلاہٹ اور اضطرابی کیفیت، جدید شاعری کے خاص موضوع بن گئے۔ نئی شاعری میں فنی اعتبار سے پرانی تراکیب، تشبیہ و استعارے سے انحراف ہی نہیں کیا گیا بلکہ نئی علامتیں وضع کرنے، الفاظ کو نئے معنی دینے اور اچھوتے تجربوں کو پیش کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی گئی۔ اس دور کے تقریباً تمام شعرأ کے یہاں یہی رویہ ملتا ہے۔

سمجھے گا کون جاگتی آنکھوں کے کرب کو
میں اپنے حادثے کا اکیلا گواہ ہوں

بشر نواز

سوچوں تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو ایک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

شکیب جلالی

کچھ نہ کچھ ساتھ اپنے یہ اندھا سفر لے جائے گا
پاؤں میں زنجیر ڈالوں گا تو سر لے جائے گا

بانی

عجب سپردگیِ برگِ زرد تھی اس میں
وہ شخص کانپ اٹھا تھا ہوا کے چلتے ہی

مصور سبزواری

دم بخود تھے لوگ اپنے آپ سے سہمے ہوئے
گھر کے اندر عافیت کا یک بھی گوشہ نہ تھا

نشتر خانقاہی

شہر وفا میں دھوپ کا ساتھی کوئی نہیں
سورج سروں پہ آیا تو سائے بھی گھٹ گئے

پروین شاکر

یہ کیوں دوراہے پہ تم رکھ گئے ہو جلتا دیا
اندھیرا اور بھی گہرا دکھائی دیتا ہے

من موہن تلخ

میں ایک ذرّہ مری حیثیت ہی کیا ہے مگر
ہوا کے ساتھ ہوں اُڑتے ہوئے غبار میں ہوں

عادل منصوری

عتیق اللہ کی شاعری بھی اسی قسم کے جدید شعری منظر نامے کو پیش کرتی ہے لیکن ان کا بیان اور ان کے تجربے جلالی مزاج سے پُر ہونے کے باعث ذرا مختلف نظر آتے ہیں۔ پہلے مجموعے میں اظہار کا رنگ تیکھا اور تیز ہے جبکہ دوسرے مجموعے میں یہ رنگ آہستہ رو اور مدھم ہے۔ان کے شعری موضوعات بھی کم وبیش وہی ہیں جن پر ان کے معاصر شعرأ نے قلم اٹھایا ہے لیکن بعض موضوعات: بے ہنگم زندگی، ناقدری و ناآسودگی، جھنجھلاہٹ اور غم وغصہ، تلخی زماں اور احساسِ ناکامی وغیرہ میں بالخصوص ان کی فنی صلاحیت عروج پر نظر آتی ہے کیونکہ ان موضوعات کو برتنے میں ان کا انداز بالکل جداگانہ ہے۔ زور آوری اور داخلی ضرب کاری کا ایسا انداز ان کے معاصرین میں کسی کے حصے میں نہیں آیا۔ کرب آمیز لہجہ اور جھنجھلاہٹ و جھلاہٹ کی لَے اس قدر تند و تیز ہے کہ ذہن کا ہر دریچہ اس کی زد میں آجاتا ہے۔ باریک بینی، زبان کا تیکھاپن اور احتجاج کی زبردست پیش کش نے ہی ان کی شاعری کو دو آتشہ بنا دیا ہے ۔ دراصل عتیق اللہ کی شاعری جدید انسان کے داخلی المیہ کا اشاریہ ہے۔ان کے یہاں انسانی کرب، تنہائی، خوف، ناآسودگی اور شکستگی کے احساسات ایک بامعنی پیکر میں ڈھل کر عصر حاضر کے انسان کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعاتی اعتبار سے یہ عصری تقاضے ان کے شعری بیان کو ایک قوت فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے بیشتر جدید شعرأ کے یہاں خیالات کی یکسانیت اور تقلید کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے لیکن عتیق اللہ کے یہاں یکسانیت اور تقلید کا شائبہ نہیں ہوتا۔ان کے یہاں صداقت کا برملا اظہار ہے اس لئے ان کے تجربے میں ایک قسم کی تازگی اور بیان میں نیا پن ہے۔

نسوں میں قینچیاں چلتی ہیں ایک ساتھ کئی

اور ان پہ تان دیے ہیں لباس پتھر کے

تمام جھوٹے سہارے تھے اس کی تحریر یں
بٹھا کے ناؤ پہ کاغذ کی مجھ کو ٹال گیا

شیشے کی کرچیاں سی بدن میں اتر گئیں
اس کا لباس اس کی جسامت پہ تنگ تھا

ایک لمحے کے لئے چلتی زمیں ٹھہری تھی
فاصلے دست درازی پہ اتر آئے ہیں

کس کے پیروں کے نقش ہیں مجھ میں
میرے اندر یہ کون چلتا ہے

ایک عمر کی منافرت کے بعد
اب تجھے سمجھ میں آ رہا ہوں میں

نئی شاعری کی بنیاد اس امر پر رکھی گئی ہے کہ اس میں عصر نو میں نمایاں ہونے والے واقعات وحادثات کو ترجیح دی جائے اور نئے علائم ورموز کو اردگرد کے ماحول سے منتخب کر کے پیش کیا جائے۔اس لئے جدید شعرأ کے یہاں روایتی شاعری سے انحراف کی جو صورت ملتی ہے وہ اسی سبب ہے۔اس انقلابی تبدیلی اور واقعاتی کرب کو دل گرفتہ کیفیات کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش انہیں جدید شعرأ کی مرہونِ منت ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ

''عصری ماحول کے سچے تجربے اور اس
کی ناسازگاری کے خلاف مقاومت یا
اس ناسازگاری پر بے چارگی آمیز غصّہ،
تازگیِ اظہار کی کوشش میں اس طرح خلط
ملط ہو گیا کہ جدید غزل میں نئی آواز کا
امکان روشن ہونے لگا۔عتیق اللہ کے
مجموعے کی اشاعت کے بعد آواز کا یہ

نیا پن روشن تر ہو گیا اور اسی تناسب سے
اظہار کا بے ڈھنگا پن بھی گھٹنے لگا۔''

عتیق اللہ کی شاعری اس نئی آواز کے روشن امکان کی عمدہ مثال کہی جا سکتی ہے ۔حالانکہ پہلی نظر میں ان کی شاعری ذات کی نوحہ خوانی معلوم ہوتی ہے لیکن اشعار کی داخلی تہوں پر نظر پڑتے ہی نفسیاتی کش مکش اور وارفتہ خیالی کا احساس ہو جاتا ہے ۔اس آباد خرابے کی فضا کو انہوں نے کہیں مجسم پیکر بنا دیا ہے تو کہیں تجرید کے گراف میں پیش کیا ہے اور یہی انداز ان کی شعری شناخت کی سب سے بڑی دلیل بن گئی ہے۔

دو پتھروں کے بیچ میں رکھ کر پچک مجھے
محسوس کچھ تو ہو کسے کہتے ہیں زندگی

کچھ تیرا درد چاٹ گیا ہے مرا بدن
کچھ زندگی نے پی لیا اندر تلک مجھے

ہر بار وار کرتا ہے ہر بار خود کشی
بہروپ بن کے رہ گیا اندر کا آدمی

ہر اک سفر کے بطن سے اتنے سفر ملے
مسدود ہو کے رہ گئیں راہیں حیات کی

زہرابِ غم کی یہی کیفیت عتیق اللہ کی شاعری کا خاص رنگ ہے ۔انہوں نے عہدِ نو کو بے اطمینانی کی نظر سے دیکھا اور ویسا ہی شعری کردار تراشا لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ٹھوس حقیقتوں کی پردہ دری بھی کی ۔داخلی تنازعے اور مجادلے میں جہاں زبان و بیان کھردرے ہو گئے ہیں وہاں علامتی اور استعارتی نظام کا دائرہ بھی پھیلا ہے ۔عتیق اللہ کو اپنی ناقدری کا بڑا احساس ہے ۔جب انسان کو اس کا صحیح منصب نہیں ملتا جس کا وہ حقدار یا مستحق تھا تو یہ احساس آہستہ آہستہ اس کے دل و دماغ میں گڑھ ڈال دیتا ہے اور نفسیاتی اعتبار سے وہ اپنے آپ کو Neglected سمجھنے لگتا ہے ۔اس قسم کے احساسات سے دو چار ہونے والے انسانوں میں ردعمل کی طاقت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ وہ ایک طرح سے سماج کا باغی

انسان بن جاتا ہے۔عتیق اللہ کی شاعری بھی اسی قسم کی بغاوت کا اظہار ہے:

میں ایسا بچہ تھا نالی میں جس کو پھینک دیا
بلکتا دیکھ کے مجھ پر جھپٹ پڑیں چیلیں

تان کر نوکیلے نیزوں پر ہم اپنی گردنیں
شہر کے گرتے ہوئے بازو کا منظر بن گئے

لہو کی سلطنتوں کا زوال مجھ میں دیکھ
میں کولتار کا پگھلا ہوا سمندر ہوں

دنیا کسی سلوک کے قا بل نہیں رہی
اس کو گلے لگا کے میں مشکل میں پڑ گیا

شاید میں ریگ زار کا اندھا سراب تھا
کوئی گزر گیا ہے مجھے دیکھتا ہوا

داخلی تصادم کے اظہار کے ساتھ عتیق اللہ متضاد کیفیت کو بھی پیش کرنے میں کا میاب ہیں اس لئے یکسرے پن کا احساس نہیں ہوتا:

مجھ میں خود میری عدم موجودگی شامل رہی
ورنہ اس ماحول میں جینا بڑا دشوار تھا

اس دشت نوردی میں جینا بہت آساں تھا
ہم چاک گریبان تھے سر پہ کوئی داماں تھا

تجھ کو گلے لگایا تو یہ راز بھی کھلا
تیرے بدن میں میرے لہو کی بھی باس تھی

لہو میں زہر بجھی سوئیوں کے ٹکڑ ے ہیں
یہ کس نے چھوڑ دیا ہے گلے لگا کے مجھے

عتیق اللہ کی یہ داخلی بغاوت ہی دراصل ان کے شعری زبان کی اصل روح ہے ۔زمانے کے پیہم زدوکوب اور زندگی کی بے تکان یکسرے پن سے وہ بے زار و برہم نظر آتے ہیں۔اس شکست وریخت سے جہاں وہ کبھی سپر انداز ہو جاتے ہیں وہاں

ان سے لڑنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی سے فرار بھی ہے اور اسے برتنے کا ڈھب بھی۔ اس کیفیت متضاد سے ہی انہوں نے اپنے شعری ایوان کو سجایا ہے اور یہی ان کے فکر و خیال کو قوت بھی عطا کرتی ہے اور ان کے درمیان ربط بھی قائم کرتی ہے۔

زندگی اور ذات کے اثبات و نفی کا ایک متوازن انداز عتیق اللہ کی شاعری میں ملتا ہے۔ ان کے یہاں ذات زندگی اور کائنات کا ایک مخصوص نظریہ بھی ہے جو ان کے ذہنی اور تخلیقی شعور کا پتہ دیتی ہے۔ عتیق اللہ نے جہاں ایک طرف جدید تقاضوں کا خیر مقدم کیا ہے وہاں تہذیب کی بوالعجبیوں، رشتوں کی پامالی اور اخلاقی قدروں کی بے حرمتی کو طنز کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ یہ زمانے کے جبر سے شکست کھا کر ذات کے خول میں قید نہیں ہو جاتے بلکہ تعمیرِ نو کی زبردست خواہش ہی انہیں حادثاتِ زمانہ سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی فراہم کرتی ہے۔

عتیق اللہ کی شاعری کا محبوب موضوع انسان کی نارسائی اور خوابوں کی شکستگی ہے۔ ان موضوعات کے ساتھ انصاف کرنا عموماً دشوار ہوتا ہے لیکن انہوں نے اپنے دردآمیز لہجے میں بڑی ہنرمندی سے انسان کی نارسائی و ناقدری اور اس کے خوابوں کی شکستگی کو پیش کیا ہے۔ جدید غزل میں لفظیات پر زیادہ زور دیا گیا ہے اس لئے روایتی غزلوں کے مقابلے جدید غزل میں نئے لفظیات اختیار کئے گئے بالخصوص روزمرہ کے الفاظ کو غزلوں میں برتنے کی کوشش کی گئی۔ عتیق اللہ نے بھی نئی معنویت اور نئی اشاریت کے لئے نئے نئے الفاظ کو اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے اور بیان کی تقویت کے لئے بالخصوص مکروہ کیڑے مکوڑوں اور چرند پرند کا انتخاب کیا ہے جو بڑی حسن و خوبی کے ساتھ ان کے شعری تلازمے بن گئے ہیں۔ یہ مکروہات ان کے شعری بیان کا حصہ بن کر مکروہ نہیں رہ جاتے بلکہ زندگی کی کمزوریوں کو عیاں کرنے میں معاون بن جاتے ہیں۔

چھپکلی نے اپنے منہ میں داب رکھا ہے مجھے
اور میں کیڑے مکوڑوں کی طرح لاچار ہوں

بکھر رہی تھیں فضاؤں میں ہڈیاں میری

کسی عقاب کے پنجے نے مجھے جکڑ رکھا تھا
دیمکوں نے چٹ لئے تازہ کتابوں کے ورق
وقت کی تقسیم نے مجھ کو بھی ٹکڑے کر دیا
دن تھا تو اپنی روشنیاں اپنی بھیڑ تھی
شب کے سیہ کھنڈر میں ابابیل ہو گیا
ہاتھوں سے سٹپٹا کے کبوتر نکل گئے
چمگاڈروں کا غول اندھیرے پہ چھا گیا
تراش دے کسی خنجر سے میرے دست و پا
مرے حواس کو چمگاڈروں کا خون پلا

برہم ہو جاتا ہے۔لیکن جب وہ اس رویے سے باہر نکل کر خوش آئند رویے کا اظہار کرتے ہیں تو ان کا کلام عتیق اللہ کی شاعری عشقیہ جذبات سے عاری نہیں۔انہوں نے اس معاملے میں بھی بڑی حساس طبیعت پائی ہے ان کے عشقیہ اشعار دل کی تہوں سے نکلی ہوئی آواز معلوم ہوتے ہیں۔ٹوٹے ہوئے دل کا ایک لطیف تصور ان کے یہاں موجود ہے۔ان کی رومان پسندی اور جمالیاتی احساس پر شدت کا غلبہ ہے اس لئے لذت پسندی اور ہوس کاری کا کوئی پہلو اس میں نظر نہیں آ تا بلکہ معاملات عشق میں بھی ایک رکھ رکھاؤ نظر آتا ہے محبوب پر سب کچھ لٹا دینے اور اور اسے اپنے میں ضم کر لینے کی زبردست خواہش ان کے عشقیہ جذبات کو ایک نیا معنی عطا کرتی ہے۔محبوب سے راز و نیاز کی باتوں سے زیادہ ان کی نظر رشتے کو استوار کرنے اور اور اس میں اعتدال پیدا کرنے پر رہتی ہے۔وہ حقیقت کی نظر سے ہی اپنے رشتے کو دیکھتے اور رومان کی دنیا میں کھو جانے سے زیادہ عملی تعلق (practical relationship) کو اہمیت دیتے ہیں۔ذہنی اور جسمانی ضروریات کو ناروا نہیں مانتے بلکہ اس کا اظہار صحت مند رویے سے کرتے ہیں۔کہیں کہیں ان کے رویے میں منافرت اور ہٹ دھرمی بھی نظر آتی ہے۔ایسے موقعوں پر ان کا رومانوی اور جمالیاتی نظام درہم جمالیاتی فکر کا نمونہ بن جاتا ہے۔

مرے بدن کی پکاریں سنو ،لہو چکھو
اگر سمجھنا ہے مجھ کو تو مجھ میں آن گرو

اپنے بدن کی سرد گپھاؤں کی تھاہ میں
مرے لہو کا گرم سمندر بکھیر دے

ہر ایک جسم پہ لکھا ہے داخلہ ممنوع
کہاں تلک میں کیے جاوں لمس لمس کشی

لہلہاتا جسم سارا چھٹپٹا کے رہ گیا
کن طلسمی دائروں میں آ کے پتھر بن گئے

ربڑ سا تان نہ اتنا کہ ٹوٹ ہی جاؤں
تو یاد کر نہیں سکتا تو بھول جا مجھ کو

اک بار اس سے مل کے بچھڑ جاوں اس طرح
دوبارہ پھر سے یاد نہ آئے کوئی مجھے

محبوب سے بے زاری اور بے رخی بھی عتیق اللہ کے داخل میں احساس تنہائی کے سبب پیدا ہوئی ہے۔ وصال کی چاہت سلگ سلگ کر جب اپنی تاب کھو دیتی ہے تو ان کے اندرون میں اس تاب کو دوبارہ زندہ کرنے کی خواہش اس طرح بڑھ جاتی ہے جیسے شمع بجھتے وقت تیز روشنی کرتی ہے۔ محبوب کو انگیز کرنے کی جی توڑ کوشش کے با وجود جب ناکامی ہاتھ آتی ہے تو ایک چھناکے سے رشتے توڑ کر نجات کا راستہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔

اک چھناکے سے توڑ لے رشتے
آنکھ کی دُرز سے گرا مت کچھ

اگر تو میری طرف پیٹھ کر کے خوش ہے بہت
کلوچ لیپ لی میں نے بھی اپنے چہرے پر

توڑ لے اپنے سبھی لمس کے رشتے مجھ سے
تاکہ محسوس نہ ہو عمر بہت لمبی ہے

دیکھ ہر جدائی کا درد زہر ہوتا ہے
پھر پلٹ کے آئے گا چھوڑ کر نہ جا مجھ کو

اب اس سے کچھ امید ہی رکھنا ہی فضول ہے
برفاب ہو گیا لہو احساس مر گیا

''ایک سوغزلیں''میں نا آسودگی ، بے زاری و بے گانگی اور''بین کرتا ہوا شہر ''میں آسودگی قرار اور رفاقتوں کا تجربہ اپنے پورے شد مد کے ساتھ ظاہر ہوا ہے ۔اس جدید شعری حسیت کے مختلف النوع موثرات کے پیش نظر اسلوب احمد انصاری کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ

''یہ شاعر (عتیق اللہ) اپنے معاشرے
سے مربوط بھی ہے اور الگ اور منقطع بھی
''۔

یہی نہیں بلکہ اسلوب صاحب کا یہ کہنا بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ

''عتیق اللہ کے تجربے کا پیمانہ بھی منفرد
ہے اور ان کے اظہار کا لب و لہجہ
بھی۔۔۔وہ ہمیں کسی التباس میں مبتلا
نہیں رکھنا چاہتے''۔

تا ہم یہ کہنا مناسب ہے کہ عتیق اللہ نے اپنے تجربات اور احساسات کے دونوں پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔اس لئے ان کے یہاں علیحدگی بھی ہے اور لگاؤ بھی، رفاقت بھی ہے اور رفاقتوں کا تناؤ بھی، تطابق بھی ہے اور نفی کی صورتیں بھی، داخلی تصادم و کشاکش کی لطیف کیفیت بھی ہے اور کھردرا پن بھی۔اس کھردرے پن سے قطع نظر اگر شعریت کے زیر و بم پر نظر ڈالیں تو کڑی کہیں سے بھی ٹوٹتی ہوئی نظر نہیں آتی ۔ ہر شعر تازگی کے ساتھ معنی فراہم کرتا چلا جاتا ہے اور قاری کا ذہن معنی کے ساتھ رشتہ قائم کر لیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جدید شعراء میں عتیق اللہ اپنے اسلوب کے لحاظ سے خود اپنی شناخت بھی ہیں اور دریافت بھی۔

عتیق اللہ کا دوسرا مجموعہ''بین کرتا ہوا شہر''میں غزلوں کے ساتھ ساتھ بائیس

نظمیں بھی شامل ہیں ۔ ان نظموں میں کم وبیش انہیں کیفیات کا اظہار ہے جو ان غزلوں کا خاصہ ہے لیکن نظموں میں غزلوں والی ضرب کاری اور شدت نہیں ۔غزلوں کے مقابلے نظموں میں ایک قسم کی سنجیدگی بھی ہے اور بیان میں ٹھہراؤ بھی ۔ یہاں بھی ٹوٹے ہوئے رشتے کو انگیز کرنے کی کوشش ملتی ہے ،لیکن نظموں میں ٹکراؤ کی وہ صورت نہیں اور نہ ہی وہ تلخی ہے جو ان کی غزلوں کا اصل رنگ ہے بلکہ یہاں ہجر کی رتوں کو سرد آہ بھر کر اطمینان کر لینے اور وصال کے لمحوں کو مزید خوش گوار بنانے کی کوشش کی ہے ۔ حالانکہ ان کی نظموں سے ان کی بے اطمینانی بھی ظاہر ہے لیکن اس کا اظہار انہوں نے ضبط کے ساتھ اشاروں میں کیا ہے ۔محبوب کی محبت کے انعکاس کو جب یہ اپنی محبت کے پیمانے میں تولتے ہیں تو انہیں بڑی مایوسی ہوتی ہے اور یہی مایوسی انہیں آہستہ آہستہ ان کے دروں خانے کو زخم آلود کر دیتی ہے ۔''ایک ہاتھ'' ،''تم کچھ اور نہیں''،''میری انگلیاں تمہیں سوچ رہی ہیں''،''انکر''،''ہمارے مابین'' وغیرہ نظمیں انہیں احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں ۔فنی اعتبار سے ان کی نظموں کا دائرہ اندر سے بہت پھیلا ہوا ہے اور انہوں نے بڑی سادگی اور دوررس تجربات کو نظم کے مختصر کینوس میں پیش کر دیا ہے:

میں سن رہا ہوں
تمہاری آنکھوں کا شور
تمہارے مساموں سے بوند بوند ٹپکتی ہوئی آوازیں
تمہاری چھاتیوں کی نیلی نیلی لکیروں کے درمیان
کنمناتے ہوئے بچوں کی سرگوشیاں

اب تم آؤ گے
تو دیکھو گے
وقت
جہاں تہاں سے پھٹ گیا، بکھر گیا

بجھی ہوئی راکھ کے ڈھیر میں
تسلیاں منہ بسورے ہوئے پڑی ہیں

اپنے کاندھوں پر
اپنی سانسوں کے خمیازے ہیں
اور میں
اپنی ہی نیندوں میں دوڑتے دوڑتے تھک گیا ہوں

(نظم ''میں سن رہا ہوں'')

نظم کے ان چند ٹکڑوں پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ آنکھوں کا شور/مساموں سے بوند بوند ٹپکتی آوازیں/چھاتیوں کی نیلی نیلی لکیریں/کنمناتے ہوئے بچوں کی سرگوشیاں/وقت کا جہاں تہاں سے پھٹ جانا/جیسے استعارے پرانے استعاروں سے الگ ہی نہیں بلکہ اپنے اندر ایک نیا ذائقہ بھی رکھتے ہیں۔ دوسری نظموں میں بھی اسی قسم کے جدید استعارے استعمال میں آئے ہیں۔

رمزیت اور اشاریت کے ساتھ ساتھ اگر شاعری، شعری بیان کی گرمی و گداز طنز کی چبھن اور کاٹ، دردمندانہ لہجہ اور متشدد لفظیات سے معمور ہے تو وہ ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ عتیق اللہ کی شاعری میں یہ خوبی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض جگہ تحیر آمیز نحوی تجربے، انگریزی الفاظ کے استعمال اور لسانی توڑ پھوڑ سے ابہام بھی پیدا ہو گیا ہے لیکن یہ ابہام ایسا نہیں جو دور از قیاس ہو۔ انہوں نے جس ہنر مندی سے اپنے وجودی اور جذباتی تجربوں کو حسی علامتوں میں ڈھالا ہے اس کی اپنی انفرادیت ہے۔ اس لئے ان کی شاعری جدید شعری رجحان کی طرف متوجہ کرنے اور قاری پر اثر قائم کرنے میں کامیاب ہے۔

☆☆☆